

”پانی؟“

”مہین۔“

عبدل جانتے رکا تو افضل نے اُسے مخاطب کیا:

”در عبدل تو اچھاً آدمی ہے۔“

اور پھر اس نے جیب سے ڈائرنی نکالی، کھول کر کچھ لکھا، پھر کہا:

”د، آج کی تاریخ میں اپھے لوگوں کی فہرست سے میں نے عرفان کا نام کاٹ دیا  
اور تیرنامہ لکھ لیا،“

پھر عرفان سے مخاطب ہوا:

”آج سے تو بد صورت آدمی ہے اور یا در کھلہ دنیا خوبصورت لوگوں سے  
کیجھی خالی مہین رہتی ہے،“

عبدل خاموشی سے سرک گیا، محتوظی دیر میں ٹھٹھ سے پانی کے گلاس کے ساتھ والپیں آیا،

”در لوچھی افضل صاب ج! پیو،“

افضل نے تسلک ایتر نظروں سے عبدل کو دیکھا ”عبدل تو خوبصورت آدمی ہے، ہیانی  
پیا، پھر اچھا،“

”وہ دلوں کمروہ آدمی کہاں چلے گئے؟“

”گول مارکیٹ میں شراب کی دوکان ابھی بھی بیٹھی ہے۔ وہ وہاں گئے ہیں اور تمہیں  
بھی وہیں جانا ہے۔“ عرفان نے اپنے اسی زہر بھر سے بچھے میں کہا۔

افضل نے عرفان کو خاموش عضیلی نظروں سے دیکھا، پھر اٹھا اور بانہر کھل گیا۔

”یا ربا افضل تو آزادہ بند ہے۔ تم اس سے کیوں اُبھتے ہو۔“ ذاکر بولا۔

”آنذاں بندہ؟“ عرفان بڑے بڑا یا۔

”آنذاں بندہ یہاں کون ہے؟“

”میرا مطلب ہے کہ لا ایسا آدمی ہے۔ وہ کسی سیاست کا پردہ نہیں ہے،“  
”بیار بات یہ ہے کہ میں جس طرح جعلی افلاطیوں کو میرداشت تھیں کہ سکتا، بس اسی  
طرح جعلی سینئریوں کو بھی میرداشت تھیں کہ سکتا،“

”چھر اصلی آدمی کون ہے؟“

”سب جعلی ہیں صورتیں۔“

عرفان رکا، چھر لولا :

”پتہ ہے کام مرٹی سلامت کا یہنک بیلنس کتنا ہے؟“

”یہنک بیلنس سلامت کا؟ بیار وہ تو بھانک آدمی ہے۔ وہ کام کیا کرتا ہے۔ جو  
کہا تھے گا اور یہنک بیلنس بنا تے گا،“

”ذرا کہہ بھی تو تجھے پتہ نہیں، وہ بہت کچھ کہتا ہے۔“ عرفان نے معنی خیر الہاذین  
کہا اور چپ ہو گیا۔

”بیار اپنی سمجھ میں تو کچھ آتا نہیں۔“

”سمجھ بیں نہ آنے کی کیا بات ہے۔ اب کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ لوگوں کی  
پیشا نیوں پر لکھا، ہوا ہے کہ وہ کیا ہیں اور کیا کہ رہے ہیں؟“ چھر لمحہ بدل کر لولا :

”خیر پار چھوڑ واس ذکر کو۔“

”ہاں بیار، ہمیں گیا۔“

”ہاں تجھے کیا۔ تو تو آج کل کہیں اور ہے۔“ عرفان جس کا چہرہ ابھی ہنک بہت تنا  
ہوا تھا، کسی قدر نرم پڑا اور سکرایا:

”بیار ذکرہ! ادھر سے کوئی خط و ط آتا ہے؟“

”خطرہ نہیں۔“

”میرا مطلب ہے کہ یہاں آکر تم نے کبھی تو کوئی خط لکھا ہو گا۔ ادھر سے کبھی کوئی

خط آیا ہو گا۔“

”نہیں۔“

اُس نے خیف ہو کر کہا:

”میں نے بھی کوئی خط نہیں لکھا۔ اس کی طرف سے بھی کوئی خط نہیں آیا۔“

”گویا اُس وقت سے اب تک کوئی خط و کتابت نہیں ہوئی۔ کوئی پیام سلام نہیں؟“

”نہیں۔“

”اور اب تو اُس سے یاد کر رہا ہے؟ یا تو کمال آدمی ہے۔“

واقعی کتنی عجیب بات ہے، اُس نے سوچا۔ یہاں آنے کے بعد نہیں نے اُسے خط لکھا۔ اُس نے کوئی خط پہچا۔ یادوں کی لگتی بدلتی پھر اُس نے ملکی تھی۔ تم تاریک رستے پھر کمل تاریکی، پھر کوئی منور منطقہ، ایک جگہ کاتی یاد۔ صایراہ اب کتنی لمبی ہو گئی تھی اور سینہ اُس کا کتنا اُبھر آیا تھا کہ اب اُسے وہ ہیئت دوپٹے سے ڈھانپنے رکھتی تھی۔ پسروہ گول گول اُبھار پھر بھی چھلکتے رہتے۔ یاتین ان میں اُس میں کبھی زور زور سے، کبھی ہولے ہولے، کبھی اتنی ہوئے کہ اس کی آواز سرگوشی میں جاتی اور صابرہ کا منہ شرم سلال مجبو کا ہو جاتا۔ اُس کا لمحہ پنج کھاں نے سر نیدر کے مشورے سے اُس کے نام کتنا لمبا خط لکھا تھا۔

”ذکرہ باخط ٹوائی دیا؟“

”یار ٹوائی تو دیا ہے مگر۔“ کہتے کہتے رک گیا۔

”مگر کیا؟“

”یار کہیں وہ سمجھ نہ جاتے۔“

”خط اور کس نے لکھا ہے؟ اسی نے تو لکھا ہے کہ وہ سمجھ جاتے۔“

”یار اگر وہ سمجھ گئی تو۔۔۔؟“ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”تو کیا ہو جاتے گا؟“

”وہ سمجھے گی کہ۔۔۔“

دروازہ پٹیتے کی آواز ”کھولو،“ یاد کے منور منطقے سے اچانک واپس آتے ہوتے  
امن نے اس نیم نتاریک فضایں چاروں طرف نظر ڈالی۔ کوئی دروازہ پیٹ رہا تھا اور یہ دو  
پر بیٹھے ہوتے لوگ ایک ہر اس کے ساتھ دروازے کی طرف دیکھ رہتے تھے۔

”مت کھولنا، جلوس قریب ہے۔۔۔“

”پتہ نہیں کون ہے؟“

”جلوس والے ہیں، دروازہ مت کھولو،“

”اسے جھاتی بھول دو، ورنہ ان کا کیا ہے، وہ الگ لگا دیں گے۔۔۔“

عیدل کچن سے نسلک کر دروازے پر گلپا پردہ اک ذرا سرکار کر شیشے میں سے دیکھا، دیکھ کر  
مطمئن ہوا، دروازے کا ایک پڑھتوڑا بھول کر آنے والوں کو عجلت سے اندر گھسا یا  
اور فرار دروازہ پنکھہ دیا۔

”بیاروا تم نہ تو دروازہ ایسے پیٹا کہ ہمیں ڈرایا۔“ ایک صورت آشنا نے شیراز  
میں آنے والی امن مستقل ٹولی کو دیکھ کرہا۔

”اسے جھاتی ڈرایا ہوا کسی کو کیا ڈالتے گا۔“

”بامہ کیا حال ہے؟“

”براحال ہے۔ بہت توڑ پھوڑ ہوتی ہے۔۔۔“

یادوں سے بھرے دل و دماغ کے ساتھ اس نے کچھ سننا کچھ نہ سنا۔ وہ تو یادوں کے  
منطقے سے ایسے واپس آیا تھا۔ جیسے سوتے سوتے کوئی دفعتاً جاگ اُٹھے مگر نیندا اسی طرح  
اکٹھوں میں بھری ہو۔ نیند کی پری ہی ایک جھونکے کی مثال آتے اور وہ پھر دنیا و ماں فہما سے بے خبر  
ہو جاتے۔ یادوں کی پربیاں اس کے اردوگر و میڈل ایر میں تھیں۔ بھر صابرہ اس کے تصور میں چل  
بھر رہی تھی۔ جب وہ تھوڑے دلوں کے لئے ویس پور آئی تھی۔ ان دلوں ہم دونوں اپس میں

گھل مگھنے تھے۔ اینجھن کی سیٹی کے ساتھ وہ بھی اسی کشادہ چھت پر کھنچی چل آتی جہاں میں  
اب بھی، جب میرڑھ سے چھٹیوں میں آتا تو شام سے رات تک بلیٹھار پہنا اور دوسرے  
پھیلے کھیتوں کو، کھیتوں سے پرے پھیلی ریل کی پڑی کو، ریل کی پڑی سے پرے دخنوں  
کے پھیلے سلسے کو دیکھتا رہتا ہم دونوں نندیوں سے لگے سر سے سر ہوڑے کھڑے رہتے۔  
سیلٹی دیتے، دھواں اگلتے اینجھن کو، اینجھن کے جلوں میں حرکت کرنے منور ڈبوں کو دیکھتے رہتے۔  
دن کو بیٹھ بے الگ الگ دکھانی دیتے۔ مگر رات کے اندر ہیرے میں تو بس ایسے گھنٹا کچراخون  
کی قطار دوڑی چلی جاتی ہے۔ پھر اخون کی قطار کھنچتی چل جاتی، دوڑتی چلی جاتی۔ جبکہ گزر  
جاتی تو صابرہ خوشی اور حیرت سے کہتی :

«کتنی بلی ریل ہی، دیجئے ہی، دیجئے کوئی کاڑی نہیں یہ؟»  
«دلی جانے والی۔»

چران رہ جاتی۔

«یہ کاڑی دلی گئی ہے!»

«ہاں اور کیا۔»

ٹھوڑا چپ رہ کرہ :

«ذاکرہ! تم نے تو دلی دیکھی ہوگی؟ کیسی ہے دلی؟»

«بس ایک دفعہ گیا ہوں، مگر امتحان دے لوں، پھر وہیں جا کے رہوں گا۔»

«اچھا اے کیسے؟» وہ چران رہ گئی۔

«وہیں جا کے تو کہی کروں گا۔»

«اچھا؟»

رات ہو چلی تھی۔ چاند ابھی نہیں نکلا تھا۔ ہاں چند ایک ستارے آسمان کے  
پھیلاو میں دور دور چراخون کی طرح جھملے رہے تھے۔ میں نے صابرہ کے چرت بھرے

چہرے کو غور سے دیکھا۔

« صابرہ !»

« ہوں ۔»

« صابرہ ! انہوں نے دلی میں نوکری مل جاتے تو ۔ تو ۔ » میری ربان لٹکھڑانے  
لگی تھی « تو ۔ ہم دونوں مل کر وہاں رہ سکتے ہیں ۔ »

« کیا ؟ » اس نے حیران نظروں سے بھیجے دیکھا جیسے کچھ سمجھنا پائی ہو۔ پھر جب میں  
خاموش نظروں سے اُسے دیکھے گیا تو جیسے اچانک اسے کوئی بات سمجھ میں آگئی ہو۔  
ایک دم سے وہاں سے منک گئی۔

انگلے دل میں اُس سے اور وہ مجھ سے آنکھیں چراہی تھیں مگر رات ہونے پر ابھن کی  
بیٹھی اور پھیلوں کی گردگرد اپست پھر اُسے اُسی جگہ لے آئی۔ مجھ سے ہست کر منڈپ پر پہ  
ھٹوڑی رکھ کر کھڑی تھی۔ گردگاری چلتے چلتے کہیں درختوں کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی  
تھی اور انہیں سیٹی دیتے چلا جا رہا تھا۔ ہم قریب ہوتے گئے، بہت ہی قریب۔ اتنے  
کہ میں اس کے بدن کی گرامی کو حسوس کر سکتا تھا اور اس کے بدن کی رسمی کو بھی۔  
اس کے بعد ہم نے زیادہ اعتماد کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ سمدٹ کر دلی  
کی آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھا۔ اس کاہی لگنی ٹھنڈی ہندپر پر براہمیر بھٹوڑیاں ڈکاتے  
گاڑی کو جس کی زفارت کہیں آئستہ ہوتی کبھی تیرہ مار دیکھتے رہتے۔ اب اس گاڑی کے سلسلے  
میں کوئی سوال کرنے کے لئے ہمارے پاس نہیں رہ گیا تھا، جیسے ہمارا اس میں بلیٹ کہ  
دلی یا نامھٹر گیا تھا۔

پھر خالہ جان کے خط پر خطائے کہ صابرہ کو بھجو۔ امی کتنے لگیں کہ اے ہے  
تو قول نے تو میری تلی اکھاڑ کے رکھ دی۔ دن حراب پیں کیسے بھج دوں ؟

« امی ایں پہنچا اکول ؟ »

ابا بان نے مجھے غور سے دیکھا، کہنے لگے،

«دن بہت خراب ہیں۔»

«ستاہی سے جی کر گولی چل گئی۔»

«کیا؟» اس نے پونک کہ کہنے والے کو دیکھا۔

یہ بات کہنے والا عیدل تھا جو چائے کی خالی پیالیاں میٹ رہا تھا چھر سے یہ  
تشویش کے آثار تھے،

«پتہ نہیں جی، ابھی ایک آدمی مریگل کی طرف سے آیا ہے، وہ کہہ  
رہا تھا۔»

وہ اپنے جھکل سے واپس آگئا تھا اور عیدل کامنہ تک رہا تھا۔

«خراب دن آگئے جی۔» عیدل نے کہتے کہتے خالی پیالیوں سے یہ ری بوڑی  
اٹھائی اور چلا گیا۔

«میرا خیال ہے باہر نکلیں۔»

«باہر؟» اس نے عرفان کو تجھ سے دیکھا۔

«ہاں آخر یہاں اندر کیتے نک بند بیٹھ رہا گے؟ اور میری تواب ڈیوٹی کا بھی  
وقت ہو رہا ہے۔»

«پھر یہی یہاں بیٹھ کے کیا کروں گا۔ مگر چلا جاؤں گا۔»

«یہ حال باہر تکل کے دیکھتے ہیں۔»

باہر کشیدل چکا تھا۔ اس نے جیران ہو کرہ سڑک کی طرف دیکھا۔ صبح کا لمح جاتے ہوتے  
وہ اسی سڑک سے گزرتا تھا۔ اس وقت وہ روز کی طرح صاف ستری ہتھی کاریں،  
سکوٹ، سائیکلیں، رکشا یعنی اپنی منزل کی طرف دوڑی چلی جا رہی تھیں۔ بسیں  
لہری پہنندی روائی دوائی تھیں۔ دوڑتی ہوئی رکشاوں میں ہر کشندہ دوسری رکشہ سے

آگئے نکل جائے کے لئے یہ تاب عتی۔ مگر اب اس پورے رستے پر جا بجا انہیں بکھری پڑی تھیں، بکھری ہوئی انیطلوں کے درمیان جماں تمہار بکھرے ہوتے رہگے بڑا ٹکٹک شکستہ کہیں کسی بس کے، کہیں کسی کار کے۔ ایک آدھ جلی ڈبل ڈبلینیچ سڑک میں شکستہ پاکھڑی تھی۔ مگر اس سے سڑک کے ٹریفیک میں کوئی خلل نہیں پڑ رہا تھا۔ ٹریفیک اس وقت تھا ہی تکنا؟ اکا دکا کار، بیچ میں بڑی انیطلوں سے بچتی بچاتی کچھ سہی سہی ڈبل ڈبلکر کے پاس سے گزرتی اور ہمارا راہ آنے پر اچانک اس کی رفتار تیز ہو جاتی۔ پھر لمبے وقف کے بعد شور کرتی، انیطلوں پر سے گزرتے ہوئے جھکاوے کھاتی، پہنچانے کی ڈری جلی جاتی۔ پڑوں پیپ کے قریب سے گزرتے گذرتے اس نے دیکھا کہ ایک بھیڑ جمع ہے یہ بھیر جیران نظر فول سے اس بھی موٹکار کو تک رہی تھی جو اوندرھی بڑی پڑی تھی۔ چاروں پیسے آسمان کے ہام مقابل، پھٹت زمین سے متصل۔

جیرت زدہ بھیر سے گذر کر کے آگے کیا نیشنل آڈیو ٹریم کے سامنے ایک غضبناک ٹولی بکھری تھی، ایک معزز شخص آڑی ٹویوریم میں داخل ہوتے ہوئے ٹھٹکا:

”کیوں صاحب! کیا تقریبہ ختم ہو گئی؟“

”دری پوچھئے کہ کیا تقریبہ شروع ہوئی تھی؟“

”تو تقریبہ نہیں ہوتی؟“

”نہیں۔“ ایک نوجوان نے لال پیلے ہو کر کہا:

”سامراجی دلے، کئے کے پچے۔ ان کی تقریبہ وں کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔“

ایک سکوڑٹ فرائیے بھرتا ہوا آیا، قریب اکھر رکا:

”اب اوپر کیا ہو رہا ہے؟“

”کہ سیاں چل رہی ہیں۔“

سکوڑٹ سوار تیپستول نکال کر ہوا میں فائز کیا، سکوڑٹ سٹارٹ کیا، یہ جا وہ جا۔

”یا اس کی کارہی تو یہاں کھڑی ہو گی؟“

”گذراً آئیڈیا دلے نے غریبوں کو لوت کے خریدی ہے، جلا دو۔“

امی نے دھڑکتے دل اور دہشت زدہ نظروں سے اس کا استقبال کیا، بلا تین لیں،  
بھٹاٹھا کر مجھ سے دل کے ساتھ کھاہے

”یا اللہ! تیر اشکنہ ہے۔“

”ہوا کیا؟“ اس نے تعجب سے امی کو دیکھا۔

”اسے بیٹے! میں تو ہوں گئی۔ ملے میں شور پڑا ہوا تھا کہ گولی چل گئی تیر اور کا دم  
اوپر نیچے کا دم نیچے۔ بولائی ہوتی بار بار دروازے پر جاتی تھی۔ دعا مانگتی رہی کہ اے اللہ!  
میرا پچھے باہر گیا ہوا ہے، خیرست سے واپس آتے۔“

”کیا ذاکر آگیا ہے؟“ باہر کے کمرے سے ابا جان کی آفاز آتی۔

”جا بیٹے باپ کو صورت وکھا کرما۔ وہ بھی پریشان تھے۔“

کمرے میں قدم رکھا تو دیکھا کہ ابا جان کے ساتھ خواجہ صاحب بھی بیٹھے ہیں۔

”بیٹے! ہمارا سلامت کہاں ہے؟“ خواجہ صاحب نے فوز آہی سوال کر دیا۔

”سلامت مجھے دوپھر کو ملا تھا، پھر وہ اجمل کے ساتھ کیں نکل گیا۔“

”بے ایمان جلوس کے ساتھ گیا ہو گا۔“

”جلوس کے ساتھ؟۔۔۔ پتہ نہیں۔۔۔“

”بے ایمان تے نہیں پریشان کر رکھا ہے،“ خواجہ صاحب نصیہ میں بڑا تے۔

”سُنا ہے گولی چلی تھی؟“

”و گولی؟۔۔۔ نہیں۔۔۔“

”نہیں جلی تو جل جاتے گی۔۔۔“

”کیا کہ فیو لاگ گیا ہے؟“ ابا جان نے متنانت سے سوال کیا۔

”ابھی تو نہیں لگا ہے۔“

”کب تک نہیں لگے گا؟ اللہ تعالیٰ نے اس لذکر پر رحم کرے۔“ ابا جان نے ٹھنڈا سالش پھرا۔

”مولانا اکر فیو تو امرتسر میں لگا تھا جس نے کھڑکی سے گردن ایک دفعہ باہر نکالی پھر اسے اندر نہیں لے جاسکا۔ گردن باہر تکلی اور گولی آئی۔“

”بھائی کب کی بات کر رہے ہو؟“

”مولانا اب بھلیا تو والہ باغ کے زبانے کی بات ہے۔ کیا آگ لگی تھی؟ یعنی راتوں تک کسی نے گھر میں چڑاغ نہیں جلا دیا۔ اتنی روشنی تھی اس آگ کی۔“

”جی؟“ اس نے تجھی سے خواجہ صاحب کو دیکھا۔

”ہاں بیٹھیے! اس بڑھائیے میں میں بھوٹ بولوں گا۔ وہ امرتسر کا سب سے بڑا پڑوالا بپ تھا۔ صاحبوں کی گاڑیوں میں وہیں سے پڑوں پھر جاتا تھا۔ یعنی دن، یعنی رات جلتا رہا۔ شعلے آسمان سے یا تین کرتیں پھر کیا ہوا کہ پیک لٹ گیا، پھر نہ از سے میں لوٹ پڑ گئی۔ بس پھر کرفیو آگ گیا کہ فیو تھا کہ قرخدا تھا۔ جس نے کھڑکی سے ذرا سچار کا بٹھا دیں سے گولی چلی، آدمی ٹھنڈا۔“

”فرمگی نے بہت خللم کئے ہیں۔“ ابا جان بڑھتا تھا۔

”مولانا اغلب تو ہم پر سب ہی نے کئے، یعنیوں نے بھی کئے اور اپنوں نے بھی کئے اب ٹسلیم نہیں ہو رہا؟“ رکے، پھر بولے:

”لگ جی انگریز کا رعب بہت تھا۔ کیا دیدیہ تھا؟ ڈونڈی پٹ گئی کہ جس نے جو مال لوٹا ہے وہ شام تک اپنے گھر کے باہر ٹوں دے سے اس کے بعد گھروں کی تلاشیاں ہوں گی۔ لوچی مولانا جی، آپ کو یقین نہیں آتے تھا۔“

جنہوں نے دھی نک نہیں لوٹی تھی انہوں نے اپنامال گلی میں ڈال دیا۔ لوگوں نے اپنی بیٹیوں کے چہرے تک گھروں کے آگے ڈھیر کر دیتے۔ شام ہوتے ہوتے امر تسری گلیوں میں ٹالس اور کھواب کے ڈھیر لگ گئے۔

اباجان خاموش سنتے رہے، حق پیتے رہے۔ پھر گھنکھا رہے، یوں لے۔

”خدا نجت ہمارے والد صاحب سنایا کرتے تھے۔ کہ سن شناون میں ایسا کم فیور کا تھا کہ مرتے والوں کے جانے سے تین تین دن نک گھروں میں رکھ لے ہے۔ کفن کے لئے کورا لٹھا میسر نہ آیا، دفن ہونے کے لئے قبر میسر نہیں آئی۔ بس موٹے جھوٹی میں پیٹا اور رات کے اندر ہیرے میں خوب دیکھ بھال کر کہ کوئی خاکی تو نہیں دیکھتا، وہیں گلی میں کہا ہاکھود کے داب جیا، چیپ ہوتے۔ پھر افسر دیگر سے بولے: یہ کیا کیا وقت آیا ہے مسلمانوں پر۔“

”مگر مولا نا اب مسلمانوں پر کون سا وقت آئے والا ہے؟“

اباجان نے انگشت شہادت آسمان کی طرف بلند کی:

”یہ اُسے خیر ہے۔“

”مولانا! ایک بات عرض کر دوں۔ اب کے ہمیں پہنچ لڑکوں کے ہانخوں بڑا وقت دیکھنا پڑتے ہے۔ میں نے سلامت کو مجھا یا کہ پتیری مت ماری گئی ہے۔ نفرے کا لگا کے کیوں اپنا لگا پھاڑتے ڈالتا ہے۔ آگے سے وہ کیا جواب یتلا ہے کہ ہم اس نظام کو بد لیں گے؟“

اباجان متنانت سے یوں لے۔

”خواجہ صاحب! اس دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر آتے، دنیا پر دلی؟“

” نہیں پسلی جی۔ ”

” میں توجیب پیغمبر اس دنیا کو نیدل سکتے تو یہ ہمارے تمہارے ساتھ کے رٹ کے دنیا کو کیا یاد لیں گے۔ ”

” مولانا! آپ نے ٹھیک فرمایا۔ دنیا نہیں پسل سکتی۔ ”

” خواجہ صاحب! ہماری یہ عمر گزتی۔ کیا کیا زمانہ آیا اور گزر گیا۔ ہر دفعہ ہمی دیکھا کہ کچھ گرم خون رکھنے والے ٹھنڈے ہو گئے۔ باقیوں نے سودا کر لیا۔ ”

” بالکل ٹھیک ہے جی۔ پھر مولانا اس حرام دے پتھر سلامت کو یہ بات بتاؤ۔ ”

” ابھی خون گرم ہے، ابھی یہ بات سمجھ بیٹھنے آئے گی۔ یہ بات تو عمر گزار کے سمجھ بیٹھنے آتی ہے۔ اور خواجہ صاحب! ہم تو اب کسی قصے میں بولتے ہی نہیں۔ ”

” بالکل ٹھیک ہے۔ پاکستان میں بولنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ”

” خواجہ صاحب! کہیں بھی بولنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ”

” ہاں جی بالکل بالکل۔ بولنے والا کپڑا جاتا ہے۔ پاکستان میں تو ہم نے یہی دیکھا ہے۔ ”  
ابجان نے غاموشی سے حق کو اپنی طرف سر کایا اور نئے متہ میں دایکھ رخیاں لوں میں گھوکئے۔

خواجہ صاحب چب بیٹھے رہے۔ پھر اچانک اس سے غاظب ہوتے  
” دو پھر کو تو وہ ہمارے ساتھ تھا۔ ”

” جی! ”

” تو جلوں کے ساتھ وہ نہیں گیا تھا؟ ”

” یہ پتہ نہیں۔ ”

” حرام زادہ۔ ” خواجہ صاحب غصے سے بڑیڑا تھے۔ پھر اولے۔

” بات یہ ہے جی کہ اس کی ماں بہت پر لیشان ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ

نبیوں والی! اپنے پر سے تو صبر کر لے گئے سے صبر نہیں آتا۔،“ رکے پھر

بڑے صبر کیسے آتے۔ ایک بیٹا اُدھر ڈھاکہ جا کے چیزوں گیا ہے، لیکن بیٹا یہاں

اپنے آپ کو یہ باد کر رہا ہے۔“

«کہہ امت کا کوئی خط آیا ہے؟»

“ یہی تو پریشانی ہے کہ اس کا کوئی خط نہیں آ رہا۔،“

“ اُس پر بھروسہ رکھو،“ ابا جان نے انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

”بس اب تو اُسی پر بھروسہ ہے۔ مولانا صاحب اور میرا بیٹا یہ دیتے ہیں بہت فرماں دار سعادت مند خدا کی قدرت دیکھو کہ جو آوارہ، بد معاش تھا وہ ہمارے سینے پر موہاگ دل رہا ہے۔ جو شریف تھا وہ غریب اُدھر جا کے چیزوں گیا۔،“ یہ لذت کرنے کا طریقہ ہو گئے۔

ابا جان نے حق پتے پڑنے خواجہ صاحب کو دیکھا۔

“ جا رہے ہو؟“

“ ہاں گھر پل کے دیکھتا ہوں۔ وہ نالائق شاید آہی گیا ہو۔“

“ ہاں پھر جاؤ۔“

”شاہ صاحب اس بذخشت کے لئے بھی دعا کرہی دو۔ اُن کی زندگی اس کے لئے بہت فکر مند رہتی ہے۔“

ابا جان نے اگست شہادت پھر آسمان کی طرف بلند کی؛

“ وہ حفاظت کرنے والا ہے۔“

خواجہ صاحب رخصت ہوتے اور ابا جان اپنا حصہ ڈھاکہ اندر چلے گئے۔ وہ بہت خدا کا ہوا تھا پینگ سے کمر گلتے ہی اسے نہیں آنے لگی۔ اس نے آنکھیں نند کر لیں گے ملند

صرف اس کے آس پاس منڈلاتی رہی، اسے آئی نہیں۔ جانے کتنی دیر تک وہ آنکھیں  
موندے کے ادھا سوتا ادھا گلتا لیٹا رہا۔ یکایک کسی نے دروازہ پیٹا۔

«کھو لو یہ بھاری دروازہ، مجھ کو اندر رکنے دو۔» باہر سے افضل کی آواز آئی۔

اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ افضل داخل ہوا۔ افضل کے پیچے سلامت اور اجمل۔

«ذا کمر!» افضل نے پہلے اسے دیکھا، پھر سلامت اور اجمل کی طرف اشارہ کیا:

«میں نے ان کا کوئی کو معاف کر دیا ہے، تو بھی انہیں معاف کر دے!»

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ افضل کی بات کا کیا حواب دے۔ افضل نے کہا کہا۔

«میں کتنا ہوں انہیں معاف کر دے سے میں نے انہیں اپنی پناہ میں لے لیا ہے!»

خیر شفقت یحسرے لجھے میں کہا۔

«ذا کمر! یہ دلوں اچھے آدمی ہیں۔»

فضل یہ کھتکتے کہ سی پر بیٹھتے ہوئے بیگ میز پر رکھا۔ اسے کھوں کہ یوں نکالی اور میز پر

اجمل نے کہ سی پر بیٹھتے ہوئے بیگ میز پر رکھا۔ اسے کھوں کہ یوں نکالی اور میز پر

لکھ دی۔ ذا کمر نے یحیرت اور حرف سے بوتل کو دیکھا۔  
«یار ہماں نہیں۔»

«کیا؟» افضل نے اسے ٹھوک کے دیکھا۔

اس نے گھیر کے ہوتے لجھے میں کہا: «یار تمہیں پہتے ہے کہ میرے والدان معاملات  
میں بہت سخت ہیں۔»

سلامت نے تحقیر آمیز قہقہہ لگایا۔ «والد!»

«یار وہی سفید ڈالا ہی والا کا کا، وہی ہے نایتر اب اپ کوئی بات نہیں وہ اپنا

پچھے ہے۔ میں اسے سمجھا دوں گا، تو کلاس لے کے آ۔»

» بالپول کو نہیں سمجھایا جا سکتا۔« سلامت نے حکم لگایا۔

» تو اپنے باپ سے دوسروں کے بالپول کا اندازہ لگاتا ہے؟ « افضل بولا۔

» وہ میرا باپ نہیں ہے، « سلامت پرخ پڑا۔

» پھر کس کا باپ ہے؟ « افضل نے معصومیت سے پوچھا۔

» مجھ پر نہیں، مگر یہ کہ وہ میرا باپ نہیں ہے۔ میں عرامزادہ ہوں « اس نے پورے زور کے ساتھ دانت کچکھا تے ہوتے کہا۔

» بثوت؟ «

» بثوت یہ ہے کہ میں کھدر ہا ہوں۔ «

» یہ کوئی بثوت نہیں ہے بلکہ ایسا کے اعلان کرنے سے پہلے ماں سے تو پوچھ لیا ہوتا «

» پوچھا تھا۔ «

» پھر؟ «

» اُس جاہل عورت نے گواہی دینے سے انکار کر دیا، « اس نے افسوس کے لمحے بن کہا۔ پھر افسر دہ آوات میں بولا۔

» ہمارے باپ ظالم ہیں اور ہماری مائیں جاہل ہیں، «

یہ کہتے کہتے اس نے رونا شروع کر دیا۔

اجمل نے سلامت کو روتا دیکھا تو اس کی آنکھوں سے تھی آنسو چاری ہو گئے۔

» کا کے تو کیوں رو رہا ہے؟ «

» یا مری میں سلامت کی ماں سے بھی زیادہ جاہل ہے۔ میں نے اس سے پوچھا تو

اس نے پہلے بھی دوہرڑا ماری، پھر اپنے بال نوچ لئے اور مجھنے لگی۔ «

اضفال نے اجمل کو گھوڑے دیکھا، پھر روتے ہوئے سلامت کو دیکھا اور اس کی

آنکھیں غصے سے سرخ ہوتی چلی گئیں۔ « تم دونوں مکروہ آدمی ہو۔ «

اجمل نے سلامت کی طرف دیکھا، سلامت نے اعلان کیا "افضال حق بات کہتا ہے  
ہم مکروہ لوگ ہیں۔"

"میں تمہیں اپنی پناہ میں لینے سے انکار کرتا ہوں۔ مکروہ آدمیوں یہاں سنئے جاؤ۔  
یہ ایک طیب آدمی کا کمرہ ہے۔"

سلامت اُنھی کھڑا ہوا۔ اجمل نے یوتل بیگ میں رکھی اور سلامت کی تجھے پیچے  
کمرے سے نکل گیا۔

"ذاکرہ! تو اچھا آدمی ہے، تو مجھے معاف کر دے۔"

"یا رکیسی باتیں کہ رہے ہو۔"

"نہیں، تو مجھے معاف کر دے۔"

"کس بات پر؟" اس نے پر لشیان ہو کے افسانوں کو دیکھا۔

"میں نے ایک طیب آدمی پر دو خیث روحوں کو مسلط کرنے کی کوشش کی میں نے  
گناہ کیا ہے۔ اسے اچھے آدمی بچھے معاف کر دے، میں گھنگار ہوں، یہ کہتا کہ اس  
کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو ڈیڑھاتے لگے۔ "ہم گھنگار لوگ ہیں اور عذاب  
میں ہیں۔"

---

مال روڈ کو آج اس نے پر سکون پایا اور افسوس ہوا، مل یہاں کتنی قیامت اٹھی ہوتی تھی۔ کاریں جن کے شیشے چکنا چور ہو چکے تھے۔ ڈبل ڈیکر جو ادھر جیلی حالت میں، بیچ رستے میں، سلاںے دن کھڑے ہی اور یہاں ہونے والی قیامت کا اعلان کرتی رہی۔ انیں برساتے انفرے رکھتے بلوس، بدر حواس را بھیر، بند ہوتی دکائیں، ایک سور کے ساتھ گرتے ہوئے شتر، سڑک پر انہری اینٹوں اور شیشوں سے بخوبی بچاتی کوئی خوفزدہ بس، کوئی آہا دکا رکشہ ایں سکون تھا۔ اور سڑک یہاں سے وہاں تک صاف تھی۔ نہ انیں پڑتی ہوتیں، شیشے کی کرچیاں بکھری ہوتیں۔ بڑی ایک ایک ہوازی کے ساتھ رواں دعاں تھا۔ آدم سے چلتی ہوتی کاریں، ایک سے چیخھے دوسرا، دوسرا کے تیچھے تیسرا۔ کسی کاشیش لٹوٹا ہوا نظر نہیں آرہا تھا۔ جیران ہوا کہ مل تو لگتا تھا کہ شہر کی سب کاروں کے شیشے چکنا چور ہو چکے ہیں مگر یہ تو شر کی سب کاریں سلامت ہیں اور وہ ڈبل ڈیکر جو کل شام تک بیچ رستے میں ادھر جیلی کھڑی تھی کہاں چلی گئی۔ مال اونڈھی ہو جانے والی کار پڑوں پر کے قریب اُسی طور اونڈھی پڑتی تھی کہاں چلی گئی۔ مال اونڈھی اس راہ سے گزرنے والوں کی آنکھوں میں کوئی تجسس کوئی حرمت نہیں بھی جیسے یہ کار کسی الگے راستے میں اونڈھی ہوتی تھی اور اب امند اور زمانہ سے چونکتے کی صلاحیت سے خودم ہو چکی ہے۔

میطرو و ائنڑ کے پرایہ سے گزرتے ہوئے اندر باہر کے شکستہ شیشوں کو خوزر سے

و دیکھا، یہ شکستہ شیشے غمازی کر رہے تھے کہ ہمارا کل بہت کچھ ہو چکا ہے۔ آج کچھ نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی مال کو کچھ ہو گیا تھا۔ مل کا سور جتنا عجب رکھتا تھا، آج کی خاموشی اس سے زیادہ عجیب نظر آتی۔ یہ بھی عجیب رکا کہ کالج کے برآمدوں کے باہر اور لان بن جنتنگلے کل اونہ سے پڑھتے تھے اتنے ہی وہ سب سیقے سے رکھتے تھے کالج میں تنظم و ضبط والیس آگیا تھا۔ کل اس قاعدے سے قربنے سے ہو رہی تھیں۔ سامنے بزرہ ذرا میں طلبائی ٹولیاں چل پھر رہی تھیں، لیکے راتوں رات کتنے پڑا من ہو گئے تھے۔ کل تک کیا عالم تھا کہ ذرا سی ہات پر مندر سرخ ہو جاتا، لیکے کی رگبیں تو جانیں، حلیں کو پوری طرح بروئے کار لایا جاتا۔ گایاں، نفرے اور نمرے عجیب انہ کرتے کہ دم کے دم میں جلوس امنڈنے لگتا، ایسا کہ کالج کی چار دیواری اس پتندگ ہو جاتی کہ اس سے نکل کر باہر پھیل جاتا۔ اور اپ؟ اب اتنا من تھا کہ کوتی اوپنی آفاز میں بولنا دھکاتی نہیں پڑتا تھا۔ یا ایس ہو رہی تھیں مگر سرگوشیوں میں۔

”یا اے! میرا بھائی راستہ ہی کی فلاٹ سے آیا ہے۔“

”اچھا؟“

”ایکشن شروع ہونے کے بعد چلا ہے۔“

وہ بس اسی وقت شروع ہوا تھا۔ بتانا تھا کہ انٹر کون سے انٹر پورٹ تک پہنچنا مشکل ہو گیا۔ رستے میں ٹینک ہی ٹینک۔ کہتا ہے کہ جیسہ تم یہاں کی طرف جا رہے تھے تو ایسا دھماکہ ہوا جیسے تو پچلی ہوا اور پھر تو ایسی دھوں دھاں ہوئی جیسے جنگ شروع ہو گئی ہو۔ اور جیب ہمارے یہاں تھے ٹینک، آفت کیا اور ہم نے باہر کی طرف دیکھا تو دو تک دھواں ہی دھواں تھا۔“

”اچھا؟“

”مگر ہو گا کیا؟“

”اگے جو کچھ بھی ہو سلے بیگا یوں کے تو دھوئیں اڑ گئے۔“

« حرامزادے۔» متنہ ہی متہ میں غصہ میں کوئی بڑا بڑا ایسا  
« اب طبیعت صاف ہو جاتے گی۔»

مسرت، پیزاری، نفرت، غصہ، ہر صورت انہمار سرگوشیوں میں ہو رہا تھا۔ اس کا دم  
گھلٹنے لگا۔ اس بند قضاۓ سے زکلتا چلا ہے۔

صلائی دوڑ مسجد نک۔ پھر وہی شیراز مگر فضائلوں میں بند عتمی، نہ کوئی شور، نہ ہنگامہ،  
نہ قہقہے، نہ اپنی آوازیں۔ صرف پھروں کے اُتار چڑھاؤ سے پتہ چلتا تھا کہ کوئی شکین مسئلہ  
مسئلہ زیرِ بحث ہے۔

« یا رکل یہاں کتنا ہنگامہ تھا۔ اور آج۔»

« ہاں! اور آج۔» عرفان متہ، ہی متہ میں بڑا بڑا ایسا اور پھر جاتے پہنچنے لگا۔

« یا رکل تو یہی واقعی ڈر گیا تھا۔ لگتا تھا کہ بس آج۔» اس پر خود واضح نہیں تھا۔

کہ آگے وہ کیا کہنا چاہتا تھا؟

« پھر تو اچھا ہی ہوا۔» عرفان نے ٹنزہ بھرے لہجے میں کہا۔

« ایک اعتیار سے تو اچھا ہی ہوا۔»

« ہم ہر مرتبہ یہی کہتے ہیں مگر بعد میں پتہ چلتا ہے کہ اچھا نہیں ہوا۔»

« یا رکچھ بچھ میں نہیں آرہا مگر بچھ لگتا ہے کہ کچھ ہو گیا ہے۔»

« کچھ سمجھ میں تو میرے بھی نہیں آرہا مگر بچھ لگتا ہے کہ کچھ ہو گیا ہے۔»

« کیا ہو گیا ہے؟»

« یہی تو واضح نہیں ہے۔ مگر وضاحت میں رکھا بھی کیا ہے؟ میں مبہم طور پر جو کچھ  
محسوس کرتا ہوں وہی سب کچھ ہے۔»

عرفان مبہم طور پر جو محسوس کر رہا ہے وہ کیا ہے، اس کے اندر جو خوف سرسرار ہا ہے۔

وہ کس بات کا ہے؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا پھر اُس نے بات، ہی بدل دی۔

”یا اسی سلامت اور اجمل کہاں ہیں؟“

”آج وہ اپنے بلوں میں ہیں جو بلوں سے تزوہ اُس وقت نکلتے ہیں جب بلوں سے نکلنے

کا موسم ہوتا ہے۔ موسم آج بدل چکا ہے۔“

”تزوہ سنگی آگیا۔“ اس نے کھلتے دروازے کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کون سنئی؟“

”یاروہ سفید بالوں والا آدمی۔“ اس نے سرگوشی میں کہا کہ وہ سفید بالوں والا آدمی  
ابھی ابھی دروازہ کھول کر داخل ہوا تھا اور سیدھا ان کی طرف آ رہا تھا۔

”میں بیٹھ سکتا ہوں؟ میں آپ کے چند منٹ لوں کا۔“

”ضرور ضرور۔“ اس نے یہ کہتے کہتے عرفان کی طرف دیکھا جس کے قیوں بتا رہے تھے کہ  
اسے یہ مداخلت پسند نہیں آئی ہے۔

”کیا خیال ہے آپ کا، یہ اچھا ہوا یا بسا ہوا؟“

”آپ کا کیا خیال ہے، یہ بہت اچھا ہوا ہے۔“ عرفان نے تلخ سے لمحے میں کہا۔

”بہ تو میں نہیں جانتا کہ یہ اچھا ہوا ہے یا نہیں، اتنا جانتا ہوں کہ اگرہ اس طرح پاکستان

کو بچایا جا سکتا ہے تو۔“

”کس طرح اس طرح۔“ عرفان کو غصہ آگیا۔

سفید بالوں والے تے عرفان کو دیکھا، پھر پسکون لمحے میں کہا:

”آپ میرے سر کے بال دیکھ رہے ہیں۔“

”دیکھ رہا ہوں، سب سفید ہیں۔ آپ سفید بالوں کا واسطہ دینا چاہتے ہیں؟“

”نہیں۔“

”پھر؟“

”میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ سفید کیسے ہوتے؟“